Al-Kashaf (Journal of Social Sciences) (Miscellaneous)
Volume: 06 No: 01. January – March 2026
ISSN: 2790-8798; E-ISSN: 2790-8801

عقیدۂ توحید کی تفہیم: تعبیراتی رجحانات اور نظائر کا مطالعہ: دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے تناظر میں

Understanding the Doctrine of Tawḥīd: A Study of Interpretative Trends and Exemplars in the Perspectives of Deobandi, Barelvi, and Ahl-e-Hadith Schools of Thought

Shahzad Ahmad *, Dr. Shoaib Arif **

** PhD Research Scholar, Department of Islamic Studies, University of Gujrat, Gujrat.*
** Lecturer, Department of Islamic Studies, University of Gujrat, Gujrat.*

KEYWORDS

Ahl-e-Hadith,
Barelvi,
Divine Attributes,
Finality of Prophethood,
Islamic Theology
Miʿrāj,
Qur'anic Interpretation,
Comparative Exegesis,
Deobandi,
Revelation,
Tawḥīd,

ABSTRACT

This article explores the interpretative trends of Tawḥīd in the Qur'anic exegesis of the Deobandi, Barelvi, and Ahl-e-Hadith schools of thought. Focusing on selected Qur'anic passages related to divine attributes, Istiwāʾ ʿalā al-ʿArsh (establishment over the Throne), the vision of Allah, Miʿrāj, divine revelation, and the Finality of Prophethood, the study presents a comparative analysis of their exegetical approaches. The findings show that all three schools agree on the fundamental doctrines of Islamic belief, including the oneness of Allah, His transcendence, the authenticity of revelation, and the finality of Prophethood. Differences primarily appear in interpretative methods, theological emphases, and modes of argumentation rather than in core beliefs. The study concludes that these interpretative variations reflect methodological diversity within Sunni scholarship while preserving a shared theological foundation.

تمہید

عقیدۂ توحید اسلامی تعلیمات کی اساس اور قرآنِ مجید کا مرکزی موضوع ہے، جس کے گرد اسلام کے تمام اعتقادی، عملی اور اخلاقی تصورات استوار ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے مختلف اسالیب اور دلائل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی صفاتِ کمال اور اس کے حقِ ربوبیت والوہیت کو واضح کیا ہے۔ اگرچہ امتِ مسلمہ کے مختلف مکاتبِ فکر عقیدۂ توحید کے بنیادی اصولوں پر متفق ہیں، تاہم قرآنی آیات کی تفہیم، ان کے اطلاقات اور ان سے اخذ ہونے والے بعض اعتقادی مباحث میں تعبیراتی تنوع پایا جاتا ہے۔ برصغیر کے دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر نے اپنے اپنے علمی، تفسیری اور منہجی اصولوں کی روشنی میں عقیدۂ توحید کی تشریح کی ہے، جس کے نتیجے میں بعض مسائل، خصوصاً توسل، استمداد، شفاعت، اولیاء کے مقام اور صفاتِ الٰہیہ سے متعلق مباحث میں مختلف تعبیرات سامنے آئی ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ ان مکاتبِ فکر کے ہاں تفہیمِ توحید کے نمایاں تعبیراتی رجحانات کا تقابلی جائزہ پیش کرتا ہے تاکہ قرآنِ مجید سے ماخوذ توحیدی تصور کی تفہیم میں موجود منہجی مماثلتوں اور اختلافات کو علمی انداز میں واضح کیا جا سکے۔

عقیدۂ توحید پر اسلامی علمی روایت میں وافر لٹریچر موجود ہے اور دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے اعتقادی تصورات پر بھی متعدد تحقیقی مطالعات انجام دیے جا چکے ہیں۔ تاہم دستیاب تحقیقات کا زیادہ تر حصہ یا تو کسی ایک مکتبِ فکر کی توضیح و دفاع تک محدود ہے یا مختلف مکاتبِ فکر کے مابین اختلافی مسائل کے بیان پر مرکوز ہے۔ عقیدۂ توحید کی قرآنی تفہیم اور اس کے تعبیراتی رجحانات کا دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے تناظر میں ایک منظم، غیر جانب دار اور تقابلی مطالعہ نسبتاً کم دکھائی دیتا ہے۔ بالخصوص یہ امر مزید تحقیق کا متقاضی ہے کہ یہ مکاتبِ فکر توحید سے متعلق قرآنی آیات کی تفہیم میں کن اصولِ تفسیر، مناہجِ استنباط اور اعتقادی بنیادوں سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کے مابین پائے جانے والے اتفاق و اختلاف کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس تحقیق میں اسی خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

*Corresponding Author: Shahzad Ahmad
Email Address: *dr.shoaib@uog.edu.pk*

دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے ہاں عقیدۂ توحید سے متعلق قرآنی آیات کی تفہیم اور تعبیر میں کون سے نمایاں رجحانات پائے جاتے ہیں، اور ان رجحانات کے پسِ پشت کون سے تفسیری، اعتقادی اور منہجی عوامل کارفرما ہیں؟

عقیدۂ توحید کی قرآنی تفہیم کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان قرآنی نظائر کا مطالعہ کیا جائے جنہیں دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر نے اپنے اپنے تفسیری، اعتقادی اور استدلالی مناہج کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ تینوں مکاتبِ فکر توحید کو اسلام کی بنیادی اور مرکزی عقیدہ قرار دیتے ہیں، تاہم بعض قرآنی آیات کی تشریح، ان کے اطلاقات اور ان سے اخذ ہونے والے اعتقادی نتائج میں تعبیراتی تنوع پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ان مکاتبِ فکر کی روشنی میں ان قرآنی نظائر کا تذکرہ کیا جائے گا جو عقیدۂ توحید کے مختلف پہلوؤں، بالخصوص الوہیت، ربوبیت، استعانت، توکل، شفاعت اور دیگر متعلقہ اعتقادی مباحث کی تفہیم میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان نظائر کے تقابلی مطالعے سے نہ صرف مختلف تعبیراتی رجحانات کی نوعیت واضح ہوگی بلکہ ان فکری و منہجی بنیادوں کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی جن کی بنا پر قرآنی نصوص کے فہم میں تنوع پیدا ہوا ہے۔

آیت الکرسی کی روشنی میں عقیدۂ توحید کی تعبیرات:

آیت الکرسی عقیدۂ توحید کے ان جامع قرآنی نظائر میں سے ہے جسے دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر یکساں طور پر توحید، قیومیتِ الٰہی، علمِ کامل، قدرتِ مطلقہ اور حاکمیتِ مطلقہ کی بنیادی دلیل قرار دیتے ہیں۔ تینوں مکاتبِ فکر اس امر پر متفق ہیں کہ آیت کا ابتدائی حصہ ﴿اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ﴾[1] اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت کا قطعی اعلان ہے اور عبادت، استعانت اور بندگی کا حقیقی استحقاق صرف اسی ذات کے لیے ثابت کرتا ہے۔ تاہم اس بنیادی اتفاق کے باوجود آیت کے بعض مضامین، خصوصاً شفاعت، صفاتِ الٰہی اور کرسی کی حقیقت کے ضمن میں تعبیراتی رجحانات میں جزوی فرق نمایاں ہوتا ہے۔

مولانا عبد الرحمن کیلانی لکھتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جو عبادت، دعا، استعانت اور حقیقی تصرف کی مستحق ہو، لہٰذا شفاعت کا اصل اختیار بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔"[2]

اسی مفہوم کو حافظ ابن کثیر نے مزید واضح کرتے ہوئے بیان کیا ہے:**

> "اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ ہے، تمام مخلوقات کو قائم رکھنے والا ہے اور اس کے اذن کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکتا۔"[3]

ان دونوں تفاسیر میں صفاتِ الٰہی کو قرآن و سنت کے ظاہر کے مطابق ثابت کیا گیا ہے، لیکن ان کی کیفیت بیان کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر کرسی کی حقیقت کو بھی ثابت مانا گیا ہے، البتہ اس کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس منہج سے واضح ہوتا ہے کہ اہلِ حدیث مکتبِ فکر توحید کے تحفظ، ردِّ شرک اور نصوصِ شرعیہ کی اصل تعبیر کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔

1۔ سورہ البقرہ:255

2۔ مولانا عبد الرحمن کیلانی، تیسیر القرآن، مکتبۃ الاسلام، لاہور، جلد اول، ص338، 2000ء

3۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مترجم: مولانا محمد جوناگڑھی، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، اپریل2009ء، جلد اول، ص379

اہلِ حدیث مفسرین اس آیت کو توحید کے اثبات اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بنیادی ماخذ کے طور پر پیش کرتے ہوئے نصوص کے ظاہری مفہوم کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ مولانا عبدالرحمن کیلانی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی عبادت، دعا اور حقیقی تصرف کی مستحق نہیں، جبکہ حافظ ابن کثیر اس آیت کو اللہ تعالیٰ کی دائمی حیات، کامل قیومیت اور شفاعت کے انحصار علی الاذن کی واضح دلیل قرار دیتے ہیں۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ حدیث منہج میں توحید کے تحفظ اور نصوصِ شرعیہ کے براہِ راست فہم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

دیوبندی مکتبِ فکر کی نمائندہ معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع نے آیت الکرسی کے ہر جملے کو ایک مستقل اعتقادی اصول کے طور پر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ مکان، نشست و برخاست اور جسمانی کیفیت سے پاک ہے، اس لیے کرسی کی حقیقت کو انسانی کرسیوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا؛ عرش و کرسی کی عظمت ثابت ہے، مگر ان کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔"[4]

دیوبندی مکتبِ فکر صفاتِ الٰہی کے اثبات کے ساتھ تنزیہ باری تعالیٰ پر خصوصی زور دیتا ہے۔ اس کے برعکس بریلوی مکتبِ فکر کی نمائندہ خزائن العرفان میں آیت الکرسی کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت، مالکیت اور ردِّ شرک کی جامع دلیل قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کرتی ہے اور نہایت لطیف انداز میں شرک کا رد کرتی ہے؛ کیونکہ جب آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملک ہے تو کوئی چیز عبادت کے لائق یا اس کی شریک کیسے ہو سکتی ہے؟"[5]

دیوبندی مکتبِ فکر کی تعبیر میں بھی توحید، قیومیت اور صفاتِ کمالِ الٰہی بنیادی موضوعات کی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم یہاں تنزیہ باری تعالیٰ اور صفات کی ایسی تشریح پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی مشابہت سے منزہ ثابت کرے۔ معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع نے کرسی، عرش اور دیگر غیبی حقائق کے اثبات کے ساتھ ان کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کا منہج اختیار کیا ہے۔ اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ دیوبندی مفسرین ایک طرف نصوص کے اثبات کو برقرار رکھتے ہیں اور دوسری طرف تشبیہ اور تجسیم کے امکانات سے اجتناب کرتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں توحید کی تفہیم میں اثبات اور تنزیہ کے درمیان اعتدال پیدا کرنے کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے۔

بریلوی مکتبِ فکر کی تعبیر میں بھی آیت الکرسی کو توحید اور ردِ شرک کی جامع بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ خزائن العرفان کے مطابق جب پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے تو عبادت اور الوہیت میں کسی دوسرے کو شریک قرار دینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ تاہم بریلوی تعبیر میں شفاعت کے باب کو نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور انبیاء و صالحین کی شفاعت کو اللہ تعالیٰ کے اذن کے تابع مانتے ہوئے اس کے اثبات پر زور دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بریلوی مکتبِ فکر توحید اور شفاعت کے باہمی تعلق کو متعارض نہیں سمجھتا بلکہ شفاعت کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اور اس کے اذن کے تحت قائم ایک مذہبی حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔

4۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، اپریل 2008ء، جلد اول، ص 611

5۔ صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، مکتبۃ المدینہ، کراچی، 2013ء، ص 62–63۔

مجموعی طور پر آیت الکرسی کی تفاسیر کا تقابلی جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے درمیان بنیادی اعتقادی ڈھانچہ مشترک ہے۔ تینوں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حیاتِ کاملہ، قیومیت، علمِ محیط، قدرتِ کاملہ اور حاکمیتِ مطلقہ پر متفق ہیں اور شفاعت کو اللہ تعالیٰ کے اذن کے تابع سمجھتے ہیں۔ اختلافات زیادہ تر تعبیر کے اسلوب، استدلال کے مناہج اور بعض جزوی تفسیری ترجیحات تک محدود ہیں۔ اہلِ حدیث مکتبِ فکر نصوص کے ظاہر اور توحید کے تحفظ پر زیادہ زور دیتا ہے، دیوبندی مکتبِ فکر تنزیہِ الٰہی اور اعتدالِ تعبیر کو نمایاں کرتا ہے، جبکہ بریلوی مکتبِ فکر توحید کے ساتھ شفاعت اور روحانی تعلقات کے بیانیے کو زیادہ وضاحت سے پیش کرتا ہے۔ اس طرح آیت الکرسی تینوں مکاتبِ فکر کے ہاں عقیدۂ توحید کی مشترکہ قرآنی بنیاد ہونے کے باوجود مختلف تفسیری مناہج اور تعبیراتی رجحانات کی نمائندگی بھی کرتی ہے، جو برصغیر کی اسلامی علمی روایت میں فکری تنوع کی ایک اہم مثال ہے۔

استوا علی العرش کے بارے میں مختلف تعبیرات

سورۂ الاعراف کی آیت 54 ان اہم قرآنی نظائر میں سے ہے جو عقیدۂ توحید، ربوبیتِ الٰہی اور تدبیرِ کائنات کے بنیادی تصورات کو نہایت جامع انداز میں بیان کرتی ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ۗ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔[6]

"بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا، وہ رات کو دن پر اس طرح ڈھانپ دیتا ہے کہ وہ تیزی سے اس کے پیچھے آتی ہے، اور سورج، چاند اور ستارے سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ سن لو! پیدا کرنا بھی اسی کا ہے اور حکم بھی اسی کا۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، جو تمام جہانوں کا رب ہے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت، مالکیت، حاکمیت اور نظامِ کائنات پر کامل تصرف کو واضح کیا گیا ہے، جبکہ آیت کا جملہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ علمِ تفسیر اور علمِ عقائد کے مباحث میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مختلف مکاتبِ فکر کے مفسرین نے اپنے اپنے تفسیری اصولوں اور اعتقادی مناہج کی روشنی میں اس آیت کی تعبیر و تشریح کی ہے۔ اگرچہ تمام مکاتبِ فکر اس حقیقت پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی جسمانیت، جہت، مکان اور مخلوق سے مشابہت سے منزہ ہے، تاہم استواء علی العرش کے مفہوم، اس کی نوعیت اور اس سے متعلق قرآنی تعبیر کے اسلوب میں بعض منہجی اختلافات پائے جاتے ہیں۔

سورۃ الاعراف کی آیت 54 کی تفسیر میں مختلف مکاتبِ فکر کے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، خالقیت، تدبیرِ کائنات اور کامل حاکمیت کو بیان کرتی ہے، البتہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کی تعبیر میں منہجی فرق نمایاں ہوتا ہے۔

6۔ سورہ الاعراف:۵۴

اہل حدیث مفسرین اس آیت کو توحیدِ ربوبیت اور حاکمیتِ الٰہی کی دلیل قرار دیتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس لیے عبادت، اطاعت مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کا پیدا کرنا بھی اللہ کا حق ہے اور حکم دینا بھی اسی کا حق ہے،[7]

اسی تسلسل میں ابن کثیر سلف صالحین کے منہج کو اختیار کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ

"استواء کو اسی طرح مانا جائے جیسے قرآن میں آیا ہے، اس کی کیفیت بیان نہ کی جائے اور نہ اسے مخلوق کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔[8] "

ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، مگر یہ استواء اس کی شان کے لائق ہے اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

دیوبندی مکتبِ فکر کی نمائندہ تفسیر معارف القرآن بھی اسی بنیادی عقیدے کی تائید کرتی ہے، تاہم وہ متشابہات کے باب میں زیادہ احتیاط اختیار کرتی ہے ۔مفتی محمد شفیع کے نزدیک " استواء کا معنی معلوم ہے، مگر اس کی کیفیت انسانی عقل سے ماوراء ہے؛ اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی کیفیت میں بحث درست نہیں۔[9] "

اسی لیے معارف القرآن قرآن کے ظاہر پر ایمان،

کیفیت کی تفویض اور اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کو ایک ساتھ جمع کرتی ہے۔ اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جسم، جہت یا مکان کے ساتھ منسلک کرنا درست نہیں، بلکہ اس کی صفات کو اس کی شان کے مطابق تسلیم کرنا ہی صحیح منہج ہے۔

بریلوی مکتبِ فکر کی نمائندہ تفسیر خزائن العرفان بھی استواء کو متشابہات میں شمار کرتی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ "استواء معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے، اور اس پر ایمان واجب ہے۔[10]

سورۃ الاعراف کی آیت 54 کی مذکورہ تفاسیر کا تقابلی جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے درمیان آیت کے بنیادی مفہوم کے حوالے سے نمایاں اتفاق پایا جاتا ہے۔ تینوں مکاتبِ فکر اس آیت کو اللہ تعالیٰ کی خالقیت، ربوبیت، حاکمیت اور تدبیرِ کائنات کے جامع بیان کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس امر پر متفق ہیں کہ تخلیق اور امر کا حقیقی اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اسی بنیاد پر آیت کو توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت کی ایک مضبوط دلیل قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم جب آیت کے جملے ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ کی تعبیر کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو اختلاف عقیدے کی بنیادوں میں نہیں بلکہ تفسیری منہج اور اسلوبِ بیان میں نمایاں ہوتا ہے۔

اہلِ حدیث مکتبِ فکر اس مقام پر سلفی منہجِ اثبات کو زیادہ نمایاں کرتا ہے، جس کے مطابق استواء کو قرآن و سنت میں وارد ہونے کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے، اس کی تاویل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور کیفیت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس تعبیر کا بنیادی مقصد صفاتِ الٰہی کے اثبات کو برقرار رکھتے ہوئے نصوص کے ظاہری مفہوم سے وابستگی کو قائم رکھنا ہے۔ اس کے برعکس دیوبندی مکتبِ فکر اگرچہ استواء کے اثبات ہی کا قائل ہے، لیکن اس کی تعبیر میں تنزیہ باری تعالیٰ اور متشابہات کے باب میں احتیاط کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ معارف القرآن میں کیفیت کی تفویض اور

7۔ مولانا عبدالرحمن کیلانی، تیسیر القرآن، مکتبۃ الاسلام، لاہور، ج2، ص40۔

8۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، مترجم: مولانا محمد جوناگڑھی، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، 2009ء، ج2، ص361-362۔

9۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، 2008ء، ج2، ص571-573۔

10۔ صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، مکتبۃ المدینہ، کراچی، 2013ء، ص298۔

انسانی عقل کی محدودیت پر زور دے کر اس امکان کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ استواء کے تصور سے اللہ تعالیٰ کے لیے جسم، جہت یا مکان کا وہم پیدا ہو۔ بریلوی مکتبِ فکر کی تعبیر بھی اسی منہج سے قریب دکھائی دیتی ہے، جہاں استواء پر ایمان کو واجب قرار دیتے ہوئے اس کی کیفیت کو مجہول مانا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہر قسم کی مخلوقاتی مشابہت سے منزہ قرار دیا گیا ہے۔

ان تعبیرات کا تقابل یہ واضح کرتا ہے کہ تینوں مکاتبِ فکر کے مابین اصل اتفاق اثباتِ استواء اور تنزیہِ الٰہی کے اصول پر موجود ہے، جبکہ اختلاف اس امر میں ہے کہ اس عقیدے کو کس انداز سے بیان کیا جائے اور متشابہ آیات کے فہم میں کس حد تک تفصیل اختیار کی جائے۔ اہلِ حدیث مکتبِ فکر نصوص کے اثبات اور منہجِ سلف کی پیروی کو نسبتاً زیادہ نمایاں کرتا ہے، جبکہ دیوبندی اور بریلوی مکاتبِ فکر تنزیہ اور تفویض کے پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس کے باوجود تینوں مکاتبِ فکر اس بات پر متفق ہیں کہ استواء علی العرش کو مخلوق کے استواء پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے جسمانیت یا مکانیت کے مفہوم میں سمجھنا درست ہے۔ یوں یہ اختلاف درحقیقت تعبیر و توضیح کے اسلوب کا اختلاف ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، عظمت اور صفاتِ کمال کے بارے میں کسی بنیادی اعتقادی اختلاف کا مظہر۔ اسی لیے یہ آیت مختلف مکاتبِ فکر کے تفسیری مناہج کے تنوع کے ساتھ ساتھ ان کے مشترکہ عقیدۂ توحید کی بھی ایک نمایاں مثال کے طور پر سامنے آتی ہے۔

رویت باری تعالیٰ کے بارے میں مختلف تعبیرات

رؤیتِ باری تعالیٰ اسلامی عقائد کے ان اہم مباحث میں سے ہے جن پر مفسرین، محدثین اور متکلمین نے تفصیلی بحث کی ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے دیدار سے متعلق آیات وارد ہوئی ہیں، جن کی تشریح و تعبیر نے علمِ تفسیر اور علمِ عقیدہ میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ بالخصوص قیامت کے دن مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کے دیدار، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعۂ طلبِ رؤیت، اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق قرآنی بیانات نے اس مسئلے کو مزید اہم بنا دیا ہے۔ اگرچہ اہلِ اسلام کے مختلف مکاتبِ فکر اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں یکتا، بے مثال اور مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے، تاہم رؤیتِ باری تعالیٰ کے امکان، نوعیت اور کیفیت کے بارے میں بعض تعبیراتی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ارشاد ہے:

وَلَمَّا جَاءَ مُوسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۚ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔[11]

اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کردہ وقت پر حاضر ہوئے اور ان کے رب نے ان سے کلام فرمایا تو انہوں نے عرض کیا: اے میرے رب! مجھے اپنا دیدار کرا دے تاکہ میں تجھے دیکھ سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، البتہ اس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب انہیں ہوش آیا تو عرض کیا: تو پاک ہے، میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں ہوں۔

11۔ سورہ الاعراف:۱۴۳

برصغیر کے دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر عموماً اہلِ سنت والجماعت کی اس رائے کے حامی ہیں کہ اہلِ ایمان کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، البتہ اس رؤیت کی کیفیت انسانی ادراک سے ماورا ہے اور اسے کسی مخلوق کے مشاہدے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس مسئلے کی توضیح میں مختلف مکاتبِ فکر نے قرآن و سنت کی نصوص، ائمۂ سلف کے اقوال اور اپنے اپنے تفسیری مناہج سے استدلال کیا ہے، جس کے نتیجے میں بعض جزوی تعبیرات اور اسلوبِ بیان میں فرق نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ رؤیتِ باری تعالیٰ سے متعلق قرآنی نظائر کا تقابلی مطالعہ مختلف مکاتبِ فکر کے اعتقادی اور تفسیری رجحانات کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس امر کو واضح کرتا ہے کہ اختلاف کے باوجود بنیادی عقائد کی سطح پر ان کے درمیان ایک مضبوط اشتراک موجود ہے۔ مولانا کیلانی لکھتے ہیں:

> حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا تو قربِ الٰہی اور شوقِ دیدار کے باعث انہوں نے عرض کیا: ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ﴾۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ﴾، یعنی دنیا کی اس حالت میں تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو مثال بنایا کہ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہا تو تم بھی دیدار کی تاب لا سکو گے، لیکن جب تجلی ہوئی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہوگئے۔ اس آیت سے دنیاوی رؤیت کی نفی ثابت ہوتی ہے، لیکن آخرت میں رؤیت کی نفی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جسم، مکان اور جہت سے پاک ہے، اس کی رؤیت کو مخلوق کی رؤیت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، بلکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو ایسی استعداد عطا فرمائے گا جس کے ذریعے وہ اس کی رؤیت سے مشرف ہوں گے۔"[12]

حافظ ابن کثیر کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سوال اس بات کی دلیل ہے کہ رؤیت اپنی اصل کے اعتبار سے محال نہیں، کیونکہ انبیائے کرام محال چیز کا سوال نہیں کرتے۔ ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ﴾ سے مراد دنیا میں رؤیت کی نفی ہے، نہ کہ آخرت میں۔ وہ قرآن مجید کی دیگر آیات اور صحیح احادیث سے آخرت میں رؤیتِ باری تعالیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک پہاڑ پر تجلی اور اس کا ریزہ ریزہ ہو جانا اس حقیقت کی دلیل ہے کہ دنیا میں مخلوق اللہ تعالیٰ کی تجلیِ جلالی کی تاب نہیں لا سکتی، جبکہ آخرت میں اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔[13]

مفتی محمد شفیع معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ

> " حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کلامِ الٰہی کے شرف کے بعد دیدار کی خواہش ظاہر کی۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ دنیا کی مادی آنکھیں جمالِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں، اسی لیے پہاڑ پر تجلی فرمائی گئی جو اپنی مضبوطی کے باوجود اس کا تحمل نہ کر سکا۔ اس آیت سے دنیا میں رؤیت کی نفی ثابت ہوتی ہے، لیکن آخرت میں اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق دیدار کی نعمت عطا فرمائے گا۔"[14]

12۔ مولانا عبدالرحمن کیلانی، تیسیر القرآن، مکتبۃ الاسلام، لاہور، 2000ء، جلد 2، ص 268

13۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، مترجم: مولانا محمد جونا گڑھی، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، 2009ء، جلد 2، ص 402-403

14۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، 2008ء، جلد 4، ص 61

"صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیدار طلب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ رؤیت اپنی اصل کے اعتبار سے ممکن ہے، کیونکہ اگر وہ مطلقاً محال ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی اس کا سوال نہ کرتے۔ مزید یہ کہ رؤیت کو پہاڑ کے قائم رہنے پر معلق کیا گیا، اور جس چیز کو ممکن شرط پر معلق کیا جائے وہ اپنی اصل میں بھی ممکن ہوتی ہے۔ تاہم دنیا میں انسانی آنکھیں اس دیدار کی متحمل نہیں، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام دنیا میں اس نعمت سے مشرف نہ ہوئے، جبکہ آخرت میں اہلِ ایمان کے لیے رؤیت ثابت ہے۔"[15]

مذکورہ تفسیری اقتباسات کے تقابلی مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر رؤیتِ باری تعالیٰ کے بنیادی عقیدے کے بارے میں اہلِ سنت والجماعت کے مشترکہ موقف پر متفق ہیں۔ تینوں مکاتبِ فکر اس آیت کو اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے دیدار کی درخواست کرنا رؤیت کے امکانِ عقلی و شرعی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کسی محال امر کا سوال نہیں کرتے۔ اسی بنا پر یہ تمام مکاتبِ فکر آیتِ مبارکہ میں وارد ہونے والے جملہ ﴿لَن تَرَانِي﴾ کو رؤیتِ باری تعالیٰ کی مطلق نفی نہیں بلکہ دنیاوی زندگی میں رؤیت کی نفی قرار دیتے ہیں، جبکہ آخرت میں اہلِ ایمان کے لیے رؤیتِ الٰہی کو ثابت مانتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے درمیان بنیادی اعتقادی اشتراک نہایت واضح ہے اور رؤیتِ باری تعالیٰ کو جنت کی عظیم ترین نعمتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اہلِ حدیث مکتبِ فکر کی تعبیر میں نصوصِ قرآن و حدیث سے براہِ راست استدلال اور آثارِ سلف پر اعتماد نمایاں نظر آتا ہے۔ تیسیر القرآن اور تفسیر ابن کثیر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کو رؤیت کے امکان کی بنیادی دلیل قرار دیا گیا ہے اور یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ دنیا میں انسانی قوتِ ادراک اللہ تعالیٰ کی تجلی کا تحمل نہیں کر سکتی، تاہم آخرت میں اہلِ ایمان کو ایسی کیفیت اور استعداد عطا کی جائے گی جس کے ذریعے وہ اپنے رب کا دیدار کریں گے۔ اس تعبیر میں رؤیت کے اثبات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بھی برقرار رکھی گئی ہے اور رؤیت کو مخلوق کے باہمی مشاہدے پر قیاس کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے۔

دیوبندی مکتبِ فکر کی تعبیر میں بھی یہی بنیادی مؤقف موجود ہے، لیکن اس کے ساتھ تنزیہ باری تعالیٰ اور عدمِ ادراکِ کیفیت کے اصول کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ معارف القرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کو اس حقیقت کی دلیل قرار دیا گیا ہے کہ دنیاوی حواس اور مادی آنکھیں جمالِ الٰہی کے تحمل کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ پہاڑ پر تجلی کا واقعہ اس امر کی علامت قرار دیا گیا ہے کہ موجودہ دنیاوی نظام میں رؤیت ممکن نہیں، البتہ آخرت کی حیات مختلف نوعیت کی ہوگی جہاں اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق اہلِ ایمان کو دیدار کی نعمت عطا فرمائے گا۔ اس تعبیر کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں رؤیت کے اثبات کے ساتھ ساتھ کیفیتِ رؤیت کے بارے میں سکوت اور تفویض کا رجحان زیادہ نمایاں ہے۔

بریلوی مکتبِ فکر کی نمائندہ تفسیر خزائن العرفان بھی اسی بنیادی موقف کی تائید کرتی ہے۔ مراد آبادی کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سوال بذاتِ خود رؤیت کے امکان کی دلیل ہے اور رؤیت کو پہاڑ کے استقرار پر معلق کرنا بھی اس کے امکان پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم دنیا میں بشری کمزوری اور مادی حدود کی وجہ سے یہ رؤیت واقع نہیں ہو سکتی۔ بریلوی تعبیر میں بھی آخرت میں رؤیتِ باری تعالیٰ کے اثبات پر زور دیا گیا ہے اور اسے

15۔ صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، مکتبۃ المدینہ، کراچی، 2013ء، ص316

اہلِ ایمان کے لیے ایک خصوصی انعام قرار دیا گیا ہے۔ یوں یہ مکتبِ فکر رؤیت کے اثبات اور تنزیہ الٰہی دونوں کو یکجا رکھتے ہوئے اہلِ سنت کے روایتی موقف کی تائید کرتا ہے۔

ان تفسیری آراء کے تقابل سے واضح ہوتا ہے کہ تینوں مکاتبِ فکر کے مابین اختلاف بنیادی عقیدے کا نہیں بلکہ اسلوبِ استدلال اور منہجِ تعبیر کا ہے۔ اہلِ حدیث مفسرین آثارِ سلف اور ظواہرِ نصوص کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں، دیوبندی مفسرین تفویض اور تنزیہ کے پہلو کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں، جبکہ بریلوی مفسرین امکانِ رؤیت اور اس کے اعتقادی اثبات پر نسبتاً زیادہ زور دیتے ہیں۔ تاہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا اثبات کسی جسمانیت، جہت، مکان یا مخلوق سے مشابہت کو مستلزم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رؤیتِ باری تعالیٰ کے مسئلے میں ان مکاتبِ فکر کا اشتراک ان کے اختلاف سے کہیں زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس قرآنی نظیر کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر کے اہلِ سنت مکاتبِ فکر رؤیتِ باری تعالیٰ کے اثبات، دنیا میں اس کی عدمِ وقوع اور آخرت میں اس کے تحقق پر متفق ہیں، جبکہ ان کے مابین پایا جانے والا فرق زیادہ تر تعبیراتی، منہجی اور استدلالی نوعیت کا ہے، نہ کہ اصولی اور اعتقادی۔

واقعۂ معراج اور قربِ نبوی ﷺ کی قرآنی تعبیرات:

واقعۂ معراج اسلامی عقائد اور سیرتِ نبوی ﷺ کے ان غیر معمولی واقعات میں سے ہے جس نے ہمیشہ مفسرین، محدثین اور متکلمین کی توجہ اپنی جانب مبذول رکھی ہے۔ یہ واقعہ محض ایک تاریخی یا معجزاتی واقعہ نہیں، بلکہ اس میں نبوت ورسالت کے بلند مقام، اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت، وحیِ الٰہی کی حقیقت اور رسول اکرم ﷺ کے امتیازی شرف کے متعدد پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلامی علمی روایت میں معراج کے مختلف ابعاد پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اسے عقائد وتفاسیر کے اہم موضوعات میں شمار کیا جاتا ہے۔

معراج سے متعلق قرآنی بیانات میں قرب، مشاہدہ، وحی اور مقامِ نبوت جیسے تصورات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان موضوعات کی تفہیم میں مفسرین نے اپنے اپنے تفسیری اصولوں اور علمی مناہج کی روشنی میں مختلف تعبیرات پیش کی ہیں۔ بعض نے ان تعبیرات کو وحی کے نزول اور فرشتۂ وحی کے ساتھ تعلق کے تناظر میں بیان کیا ہے، جبکہ بعض نے انہیں رسول اللہ ﷺ کے خصوصی مقام، روحانی مشاہدات اور شرفِ قرب سے متعلق قرار دیا ہے۔ اگرچہ ان تعبیرات میں زاویۂ نظر اور اسلوبِ استدلال کا تنوع پایا جاتا ہے، تاہم اس امر پر عمومی اتفاق موجود ہے کہ یہ تمام مباحث رسول اللہ ﷺ کی عظمتِ شان، رفعتِ مقام اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ خصوصی فضیلت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی۔[16]

پھر وہ قریب ہوا، پھر اور قریب ہوا۔ پھر دو کمانوں کے فاصلے پر بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہوگیا۔ پھر اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی فرمائی جو کچھ وحی فرمائی۔

سورۂ النجم کی آیات 8 تا 10 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ رسالت، وحیِ الٰہی، معراجی عظمت، ملکوتی مشاہدے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قربِ خاص کے بیان میں نہایت اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان آیات میں ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی﴾، ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی﴾ اور ﴿فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی﴾ جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کی تعبیر وتشریح میں مفسرین نے مختلف تفسیری زاویے اختیار کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ

16۔ سورہ النجم: ۸۔۱۰

آیات تقابلی تفسیری مطالعے میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں، کیونکہ ان میں وحی، معراج، قرب اور مقامِ نبوت جیسے بنیادی اعتقادی مباحث جمع ہو گئے ہیں۔

اہلِ حدیث مفسرین کے نزدیک آیات کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصل صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ظاہر ہوئے، پھر آپ کے قریب آئے، یہاں تک کہ دونوں کے درمیان انتہائی قرب کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اسی تناظر میں "فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی " سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ وحی ہے جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ اس تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے لیے جسمانی یا مکانی قرب مراد نہیں لیا جاتا بلکہ وحی کی صداقت اور جبرائیل امین کی وساطت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ ** "اس تفسیر میں قرب کو جبرائیل اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان قرب کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کو محفوظ رکھا گیا ہے۔"[17]

اسی منہج کی تائید میں ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، قتادہ اور دیگر سلف کے اقوال نقل کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا اور یہی ان آیات کا بنیادی مفہوم ہے۔ "ابن کثیر کی تفسیر میں ان آیات کا مرکز حضرت جبرائیل کا مشاہدہ اور وحی کا اثبات ہے۔[18]

اس بنا پر قرب کا تعلق جبرائیل علیہ السلام سے ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی جسمانی یا مکانی قرب سے۔

دیوبندی مکتبِ فکر کی نمائندہ تفسیر بیان القرآن میں بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے قرب ہی کو اصل مفہوم قرار دیا گیا ہے، تاہم اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ "قَابَ قَوْسَيْنِ " عربی محاورے میں انتہائی قرب، موافقت اور مناسبت کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق قرب صرف جسمانی نہیں بلکہ وحی کے تحمل، اطمینانِ قلب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرشتۂ وحی کے ساتھ خصوصی تعلق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق یہاں قرب مکانی اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت نہیں کیا جاتا بلکہ قرب جبرائیل کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔[19]

مذکورہ تفاسیر کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ حدیث اور دیوبندی مکاتبِ فکر کے درمیان اس آیت کی بنیادی تعبیر کے حوالے سے نمایاں اشتراک پایا جاتا ہے۔ دونوں مکاتبِ فکر آیاتِ معراج میں مذکور قرب کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان قرب پر محمول کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے لیے کسی جسمانی، مکانی یا جہتی قرب کے معنی میں لینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس مشترک تعبیر کی بنیاد تنزیہ باری تعالیٰ کے اس اصول پر قائم ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ مخلوق کی صفات، حدود اور مکانی قیود سے منزہ ہے۔ اسی لیے دونوں مکاتبِ فکر کے مفسرین آیات کے سیاق وسباق کو وحی، مشاہدۂ جبرائیل اور رسالت کے اثبات کے تناظر میں سمجھتے ہیں اور قرب کی تعبیر کو نبوی وملائکی تعلق کی ایک خاص کیفیت قرار دیتے ہیں، نہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مکانی قرب کی صورت۔

17۔ مولانا عبدالرحمن کیلانی، تفسیر تیسیر القرآن، مکتبۃ السلام، لاہور، 1432ھ، ج6، ص70

18۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، مترجم: مولانا محمد جوناگڑھی، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، 2009ء، ج5، ص151-152

19۔ مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 1953ء، ج3، ص274۔

تاہم اس اشتراک کے باوجود تعبیر کے اسلوب اور استدلال کے منہج میں کچھ فرق بھی نمایاں ہے۔ اہلِ حدیث مفسرین، بالخصوص تیسیر القرآن اور تفسیر ابن کثیر، اپنے موقف کی تائید میں سلفِ صالحین کے آثار، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، مجاہدؒ اور قتادہؒ جیسے مفسرین کے اقوال اور روایتی تفسیری روایت پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آیات کا بنیادی مقصد حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھنے کے واقعہ اور وحی کی حقانیت کو واضح کرنا ہے۔ اس تعبیر میں حدیثی روایت اور آثارِ سلف کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے، جس سے اہلِ حدیث مکتبِ فکر کا نصوص اور تفسیر بالسلف پر مبنی منہج نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

اس کے مقابلے میں دیوبندی مکتبِ فکر کی تعبیر اگرچہ نتیجے کے اعتبار سے اہلِ حدیث موقف سے قریب ہے، لیکن اس میں لسانی اور ادبی پہلوؤں کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ بیان القرآن میں "قابَ قوسین" کو عربی محاورے کے پس منظر میں سمجھتے ہوئے قرب کی معنوی جہات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرب کو صرف مسافت یا مکان کے تناظر میں نہیں بلکہ وحی کے تحمل، قلبی اطمینان، روحانی مناسبت اور فرشتۂ وحی کے ساتھ خصوصی تعلق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبندی مفسرین نصوص کے ظاہری مفہوم کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی، بلاغی اور معنوی پہلوؤں کو بھی تفسیر کا اہم جزو سمجھتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان تفسیری آراء میں اصل اختلاف کسی بنیادی اعتقادی مسئلے کا نہیں بلکہ تعبیر کے زاویۂ نظر اور استدلالی ترجیحات کا ہے۔ دونوں مکاتبِ فکر اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں مذکور قرب سے اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی جسمانی یا مکانی قرب مراد نہیں، بلکہ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تعلق، مشاہدہ اور نزولِ وحی کی ایک خاص کیفیت کا بیان ہے۔ اسی طرح دونوں کے نزدیک ان آیات کا مرکزی موضوع مقامِ رسالت کی عظمت، وحی کی صداقت اور فرشتۂ وحی کے مشاہدے کا اثبات ہے۔ چنانچہ یہ تفاسیر اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ معراج اور وحی سے متعلق قرآنی بیانات کی تفہیم میں اگرچہ مناہج تفسیر مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن تنزیہِ الٰہی، اثباتِ وحی اور عظمتِ رسالت جیسے بنیادی اصولوں پر اہلِ سنت کے ان مکاتبِ فکر کے درمیان مضبوط فکری ہم آہنگی موجود ہے۔

ختمِ نبوت کی قرآنی تعبیرات، مختلف مکاتبِ فکر کا تقابلی جائزہ

عقیدۂ ختمِ نبوت اسلامی عقائد کے بنیادی اور متفقہ اصولوں میں سے ایک ہے، جس کا تعلق براہِ راست نبوت و رسالت کے تصور اور اسلامی عقیدہ کی تکمیل سے ہے۔ قرآنِ مجید نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کو ہدایتِ الٰہی کے آخری اور کامل ترین مرحلے کے طور پر بیان کیا ہے، جس کے بعد نبوت کا سلسلہ اپنے اختتامی مرحلے کو پہنچ جاتا ہے۔ اسی بنا پر ختمِ نبوت کا عقیدہ امتِ مسلمہ کی اعتقادی شناخت اور دینی وحدت میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور تمام مکاتبِ فکر اسے دین کے مسلمہ اور قطعی عقائد میں شمار کرتے ہیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔[20]

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

20۔ سورہ الاحزاب:۴۰

ختمِ نبوت سے متعلق قرآنی تعبیرات کا تقابلی مطالعہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے ذریعے مختلف مکاتبِ فکر کے تفسیری مناہج، استدلالی ترجیحات اور تعبیراتی رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مزید برآں، یہ مطالعہ اس حقیقت کو بھی نمایاں کرتا ہے کہ برصغیر کے مختلف دینی مکاتبِ فکر، اپنے بعض فقہی اور تفسیری اختلافات کے باوجود، عقیدۂ ختمِ نبوت کے بارے میں مکمل اتفاقِ رائے رکھتے ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر بحث میں ختمِ نبوت سے متعلق قرآنی تعبیرات کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ اس عقیدے کے قرآنی مفہوم، تفسیری جہات اور مختلف مکاتبِ فکر کے ہاں اس کی تشریح و توضیح کو علمی انداز میں واضح کیا جا سکے۔

سورۃ الاحزاب کی آیت ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ کی تفسیر میں مختلف مکاتبِ فکر بنیادی عقائد کے اعتبار سے باہم متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول اور خاتم النبیین ہیں، تاہم آیت کے بعض ذیلی پہلوؤں، مثلاً منہ بولے بیٹے کی شرعی حیثیت، روحانی ابوت، اہلِ بیت کے مقام اور ختم نبوت کے بعد دینی قیادت کی تعبیر میں ان کے مناہج مختلف انداز سے سامنے آتے ہیں۔ اہلِ حدیث، دیوبندی، بریلوی اور اہلِ تشیع مفسرین سب اس آیت کو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے تناظر میں بیان کرتے ہیں، لیکن ہر مکتب فکر اپنی تفسیری روایت کے مطابق مختلف نکات کو زیادہ نمایاں کرتا ہے۔

اہلِ حدیث مفسرین میں تفسیر تیسیر القرآن اس آیت کو جاہلیت کے نظامِ تبنّی کی اصلاح کی بنیادی دلیل قرار دیتی ہے۔ اس کے مطابق منہ بولے بیٹے کو حقیقی اولاد کے احکام دینا اسلام سے پہلے کا رواج تھا، جسے قرآن نے ختم کر کے نسب، نکاح، وراثت اور محرمیت کے شرعی اصولوں کو محفوظ کر دیا۔ مولانا عبد الرحمن کیلانی لکھتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں؛ آپ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا؛ آپ کے بعد کسی نبی کی کوئی گنجائش نہیں۔"[21]

اس تعبیر میں آیت کا مرکزی رخ نسبی نظام کے تحفظ اور ختم نبوت کے قطعی اثبات کی طرف ہے۔

اسی مکتب فکر کی نمائندہ تفسیر ابن کثیر بھی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو آیت کا بنیادی سبب قرار دیتی ہے، لیکن اس میں ختم نبوت کے اثبات کے لیے متعدد احادیث کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ابن کثیر واضح کرتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص بھی نبوت یا رسالت کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا، گمراہ اور باطل ہے۔"[22]

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن کثیر کے نزدیک آیت صرف ایک معاشرتی اصلاح نہیں بلکہ عقیدۂ ختم نبوت کی قطعی اور فیصلہ کن دلیل بھی ہے۔

دیوبندی مکتب فکر کی تفسیر بیان القرآن میں آیت کا مرکزی نکتہ نسبی ابوت اور روحانی ابوت کے درمیان فرق کو واضح کرنا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ امت کے کسی فرد کے حقیقی نسبی والد نہیں، لیکن آپ پوری امت کے روحانی مربی، معلم، شفیق اور رہنما ہیں۔ "آپ کی نبوت دائمی، کامل، عالمگیر اور قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔[23]

21۔ مولانا عبد الرحمن کیلانی، تفسیر تیسیر القرآن، مکتبۃ الاسلام، سٹریٹ نمبر 20، وسن پورہ، لاہور، محرم الحرام 1432ھ، جلد 3، صفحہ 588

22۔ حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی، تفسیر ابن کثیر، مترجم: مولانا محمد جوناگڑھی، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، اپریل 2009ء، جلد 4، صفحات 292-291

23۔ مولانا محمد اشرف علی تھانوی، بیان القرآن، مکتبہ رحمانیہ، اقراء سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، 1953ء، جلد 3، صفحات 181-180

اس تعبیر میں ختم نبوت کے ساتھ امت کی روحانی تربیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ ہدایت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔
بریلوی مکتب فکر کی خزائن العرفان میں بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی روشنی میں منہ بولے بیٹے کی شرعی حیثیت بیان کی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم، روحانی شفقت اور واجب الاطاعت حیثیت کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت نسبی ابوت سے کہیں بلند ہے؛ آپ اللہ کے رسول، خاتم النبیین، شفیق ترین ہادی اور قیامت تک امت کے رہبر ہیں۔[24]

مذکورہ تفاسیر کے تقابلی مطالعے سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر عقیدۂ ختمِ نبوت کے حوالے سے مکمل اتفاق رکھتے ہیں اور سب کے نزدیک آیتِ مبارکہ رسول اللہ ﷺ کی آخری نبوت اور سلسلۂ نبوت کے قطعی اختتام کی واضح دلیل ہے۔ تینوں مکاتبِ فکر اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی بھی قسم کی نبوت یا رسالت کا دعویٰ قابلِ قبول نہیں اور آپ ﷺ کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت اپنے کمال کو پہنچ کر مکمل ہو چکی ہے۔ اس بنیادی عقیدے کی تائید میں تمام مکاتبِ فکر قرآنی نصوص کے ساتھ ساتھ احادیثِ نبویہ سے بھی استدلال کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ختمِ نبوت کا مسئلہ ان کے نزدیک محض تفسیری رائے نہیں بلکہ ایک قطعی اور اجماعی عقیدہ ہے۔

تاہم اس اتفاق کے باوجود مختلف مکاتبِ فکر کی تفاسیر میں بعض تعبیراتی ترجیحات اور مناہجِ استدلال کا فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ اہلِ حدیث مفسرین، خصوصاً تیسیر القرآن اور تفسیر ابن کثیر، آیت کے تاریخی اور تشریعی پس منظر کو نمایاں کرتے ہوئے اسے جاہلی نظامِ تبنی (منہ بولے بیٹے) کی اصلاح اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے قطعی اثبات کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ ان کی تعبیر میں آیت کا مرکزی نکتہ شرعی احکام کے تحفظ، نسبی نظام کی اصلاح اور ہر قسم کے دعویٰ نبوت کی نفی ہے۔ بالخصوص ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں متعدد احادیث نقل کر کے ختمِ نبوت کے عقیدے کو مزید مضبوط کیا ہے، جس سے اہلِ حدیث منہج میں حدیثی استدلال اور آثارِ سلف کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔
دیوبندی مکتبِ فکر بھی ختمِ نبوت کے اسی قطعی مفہوم کو قبول کرتا ہے، لیکن اس کی تعبیر میں رسول اللہ ﷺ کی روحانی قیادت اور امت کے ساتھ تعلق کو نسبتاً زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ بیان القرآن میں نسبی ابوت اور روحانی ابوت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے یہ نکتہ ابھارا گیا ہے کہ اگرچہ آپ ﷺ کسی مرد کے نسبی والد نہیں، لیکن پوری امت کے روحانی مربی، معلم اور رہنما ہیں۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبندی مفسرین ختمِ نبوت کے ساتھ مقامِ ہدایت، تربیتِ امت اور دوامِ رسالت کے پہلوؤں کو باہم مربوط انداز میں پیش کرتے ہیں۔
بریلوی مکتبِ فکر کی نمائندہ تفسیر خزائن العرفان میں بھی آیت کا بنیادی مفہوم وہی ہے جو دیگر اہلِ سنت مکاتبِ فکر کے ہاں پایا جاتا ہے، تاہم یہاں رسول اللہ ﷺ کی عظمتِ شان، تعظیمِ رسالت، روحانی شفقت اور مرجعیتِ امت کے پہلو زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس تعبیر میں ختمِ نبوت کو

24۔ مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، کنز الایمان مع تفسیر خزائن العرفان، مکتبۃ المدینہ، دعوتِ اسلامی، کراچی، طباعت اول جولائی 2012ء، طباعت دوم اپریل 2013ء، صفحہ 783

محض اختتامِ سلسلۂ نبوت کے طور پر نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے منفرد مقام اور دائمی رہنمائی کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ یوں بریلوی مفسرین کے ہاں عقیدۂ ختمِ نبوت اور مقامِ رسالت ایک دوسرے کے تکملہ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تفاسیر کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اصولی یا اعتقادی نوعیت کے نہیں بلکہ تعبیراتی اور منہجی نوعیت کے ہیں۔ اہلِ حدیث مفسرین قانونی و اعتقادی پہلوؤں اور ردِ مدعیانِ نبوت پر زیادہ زور دیتے ہیں، دیوبندی مفسرین روحانی ابوت اور تربیتِ امت کے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں، جبکہ بریلوی مفسرین تعظیمِ رسالت اور مقامِ مصطفوی ﷺ کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے باوجود تینوں مکاتبِ فکر اس حقیقت پر متفق ہیں کہ آیتِ مبارکہ رسول اللہ ﷺ کی ختمِ نبوت، عالمگیر رسالت اور دائمی ہدایت کا واضح اعلان ہے اور یہی اس آیت کا بنیادی اور مشترک تفسیری مفہوم ہے۔

خلاصہ البحث

مذکورہ مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ برصغیر کے دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر عقیدۂ توحید اور اس سے متعلق بنیادی اعتقادی تصورات کے حوالے سے وسیع پیمانے پر اشتراک رکھتے ہیں۔ تینوں مکاتبِ فکر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، ربوبیت، الوہیت، حاکمیتِ مطلقہ، علمِ کامل، قدرتِ کاملہ اور صفاتِ کمال پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور ان عقائد کو اسلامی فکر کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ختمِ نبوت، وحیِ الٰہی، مقامِ رسالت، رؤیتِ باری تعالیٰ اور دیگر بنیادی اعتقادی مسائل میں بھی ان کے درمیان اصولی سطح پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ اس مطالعے سے واضح ہوا کہ مختلف مکاتبِ فکر کے مابین اختلافات زیادہ تر تعبیر، استدلال، ترجیحِ دلائل اور تفسیری مناہج سے متعلق ہیں، نہ کہ اصولِ عقیدہ سے۔

تحقیقی جائزے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ حدیث مکتبِ فکر نصوصِ قرآن و سنت کے ظاہری مفہوم، آثارِ سلف اور براہِ راست استدلال کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی تفسیری تعبیرات میں اثباتِ نص اور ردِّ تاویلات کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس دیوبندی مفسرین نصوص کے اثبات کے ساتھ تنزیہ باری تعالیٰ، تفویضِ کیفیت اور اعتدالِ تعبیر کو خاص اہمیت دیتے ہیں، جبکہ بریلوی مکتبِ فکر عقائد کی توضیح میں مقامِ رسالت، تعظیمِ مصطفیٰ ﷺ، روحانی تعلق اور ایمانی جذبات کے پہلوؤں کو نسبتاً زیادہ نمایاں کرتا ہے۔ تاہم ان مناہجی اور اسلوبی اختلافات کے باوجود تینوں مکاتبِ فکر بنیادی اعتقادی نتائج میں بڑی حد تک ایک ہی موقف کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔

اس مطالعے نے یہ بھی واضح کیا کہ متعدد ایسے مسائل جنہیں عوامی سطح پر شدید اختلاف کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، درحقیقت علمی تعبیرات اور تفسیری اسالیب کے اختلافات ہیں۔ مختلف مکاتبِ فکر کی تفاسیر کا غیر جانبدارانہ جائزہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان میں مشترکات اختلافات کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ، نبوتِ محمدی ﷺ کی جامعیت، شفاعت کے باب میں اذنِ الٰہی کا اصول، آخرت میں رؤیتِ باری تعالیٰ کا اثبات، وحی کی قطعیت اور ختمِ نبوت کی حتمیت جیسے امور تمام مکاتبِ فکر کے ہاں مسلم اور متفق علیہ ہیں۔

نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ تفہیمِ قرآنی کے مختلف تعبیراتی رجحانات دراصل اسلامی علمی روایت کے تنوع کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان تعبیرات کا تقابلی مطالعہ نہ صرف مختلف مکاتبِ فکر کے تفسیری مناہج کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اختلافات کے باوجود ایک مضبوط مشترک اعتقادی بنیاد موجود ہے جو امتِ مسلمہ کے فکری اتحاد کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ علمی دیانت، احترامِ اختلاف اور تفسیری تنوع کے

اعتراف کے ساتھ مختلف مکاتبِ فکر کی آراء کا مطالعہ اسلامی علوم میں وسعتِ نظر، تحقیقی توازن اور بین المسالک علمی ہم آہنگی کے فروغ کا مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

تجاویز و سفارشات

مذکورہ مطالعے کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے مابین پائے جانے والے اکثر اختلافات بنیادی عقائد کے بجائے تفسیری مناہج، تعبیراتی رجحانات اور استدلالی ترجیحات سے متعلق ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قرآنی تعبیرات کے مطالعے میں اختلافی نکات کو مناظرانہ زاویے سے دیکھنے کے بجائے علمی اور تحقیقی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرزِ فکر سے مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان اعتماد، احترام اور علمی تعاون کی فضا کو فروغ مل سکتا ہے۔

مزید یہ کہ دینی جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تقابلی تفسیر اور تقابلی عقائد کے موضوعات کو زیادہ منظم انداز میں شامل نصاب کیا جانا چاہیے، تاکہ طلبہ مختلف مکاتبِ فکر کے تعبیراتی مناہج، استدلالی اصولوں اور علمی خدمات سے واقف ہو سکیں۔ اس سے یک رخی مطالعے کے بجائے جامع اور متوازن علمی رویے کی تشکیل ممکن ہو گی۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کی نمائندہ تفاسیر کا براہِ راست مطالعہ کیا جائے اور کسی مکتبِ فکر کے موقف کو ثانوی ذرائع کے بجائے اس کے اصل مصادر کی روشنی میں سمجھا جائے۔ علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ ہر مکتبِ فکر کی آراء کو ان کے اپنے سیاق و سباق اور علمی روایت کے مطابق پیش کیا جائے، تاکہ غلط فہمیوں اور غیر ضروری تنازعات کی حوصلہ شکنی ہو۔

تحقیق سے یہ بھی واضح ہوا کہ توحید، ختمِ نبوت، وحیِ الٰہی، مقامِ رسالت اور دیگر بنیادی عقائد کے حوالے سے مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان مشترکات نہایت وسیع ہیں۔ لہٰذا علمی مکالمے اور بین المسالک روابط میں انہی مشترکات کو بنیاد بنایا جانا چاہیے۔ اس سے امتِ مسلمہ کے اندر فکری ہم آہنگی اور اتحادِ امت کے فروغ میں مدد مل سکتی ہے۔

مستقبل کی تحقیقات میں دیگر اعتقادی موضوعات، مثلاً شفاعت، علمِ غیب، توسل، صفاتِ الٰہی، تقدیر، اور آخرت سے متعلق قرآنی تعبیرات کا بھی تقابلی مطالعہ کیا جانا چاہیے تاکہ برصغیر کے مختلف مکاتبِ فکر کی تفسیری روایت کا ایک جامع علمی نقشہ سامنے آ سکے۔ اسی طرح صرف تفسیری مصادر ہی نہیں بلکہ فتاویٰ، عقائد ناموں اور کلامی لٹریچر کو بھی تحقیق کا حصہ بنایا جانا چاہیے تاکہ تعبیرات کے فکری پس منظر کو زیادہ گہرائی سے سمجھا جا سکے۔

آخر میں یہ سفارش کی جاتی ہے کہ قرآنی تعبیرات کے مطالعے میں اعتدال، احترامِ اختلاف، وسعتِ نظر اور علمی مکالمے کے اصولوں کو اختیار کیا جائے، کیونکہ یہی طرزِ تحقیق نہ صرف علمی معیار کو بلند کرتی ہے بلکہ امتِ مسلمہ کے درمیان فکری قربت اور دینی ہم آہنگی کے فروغ میں بھی مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔